☆محمد شاہد رفیع

نبوی طریق انقلاب کی نمایاں خصوصیات

ہادی برحق، داعی اعظم، احمد مجتبیٰ، محمد مصطفیٰ ﷺ کے ذاتی اوصاف و کردار اور ان کو ہمہ وقت حاصل اللہ کی خصوصی مدد اور رہنمائی کے علاوہ آپ ﷺ کی لائی ہوئی دعوت کی حیرت انگیز کامیابی کی چند نمایاں وجوہات کا تعین کیا جائے تو غالباً وہ درج ذیل ہوں گی۔

۱) دعوت کی کامیابی کا مکمل یقین
۲) دعوتی عمل میں تدریج کا طریقہ
۳) دعوت کی جامعیت اور
۴) مکمل منصوبہ بندی کا اہتمام

۱) دعوت کی کامیابی کا مکمل یقین

اپنے مشن کی کامیابی پر جب تک کسی قائد کو یقین و اعتماد نہ ہو وہ جرأت، یکسوئی اور مستقل مزاجی کے ساتھ نہ خود اس کے لیے کوشاں رہ سکتا ہے اور نہ ہی اپنے پیروکاروں کو مجتمع رکھنے اور اس کے لیے قربانیاں دینے پر آمادہ کر سکتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی ۲۳ سالہ نبوی زندگی اپنے مقصد میں کامیابی کے بھرپور یقین کی گواہ ہے۔ ہم یہاں آپؐ کی زندگی کے تین نمائندہ مراحل میں اس حوالے سے آپ ﷺ کی سیرت سے رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔

ا: مکی دور میں

آغاز دعوت میں عموماً بے اعتنائی، طنز و تمسخر اور پھر عملی مخالفت کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہ مراحل نبی کریمؐ کو بھی درپیش ہوئے۔ کم ہمت یا سطح مقاصد رکھنے والے لوگ ان مراحل ہی سے گھبرا اُٹھتے ہیں جبکہ عظیم مقاصد لے کر اٹھنے والی عالی ہمت ہستیاں ان کا مقابلہ مردانہ وار کرتی ہیں۔ لیکن جب اسی طرح کے حالات میں ایک طویل عرصہ گزر جائے اور خاطر خواہ کامیابی نہ ہو رہی ہو تو بڑے بڑے اولوالعزم رجال بھی دل چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ ماضی کے جھروکوں سے جھانک کر ۱۰ نبوی کے ابتدائی مہینوں کے حالات کو دیکھا جائے تو ان کے تصور ہی سے انسان کا دل بیٹھ بیٹھ جاتا ہے۔ دور نبوت کے خفیہ تبلیغ

☆ ریسرچ ایسوسی ایٹ، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد

والے ابتدائی تین سال نکال دیے جائیں تو اعلانیہ تبلیغ کے آغاز کے چار ہی سال بعد وہ کیفیت پیدا ہو چکی تھی کہ مسلمان اور ان کے حمایتی شعب ابی طالب میں محصور ہو کر رہ گئے تھے۔ اور تین سال کے انتہائی سخت حالات، مصائب اور آزمائشوں سے نکلتے ہی آپ کا سب سے بڑا دنیاوی سہارا ابو طالب مرض وفات میں گھر چکا تھا اور ابو طالب کے انتقال کے بعد وہ حالات پیدا ہونے جا رہے تھے کہ آپؐ کے پاس مکہ سے باہر کوئی جائے قرار ڈھونڈنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ابو طالب کے انتقال کے تین ماہ بعد ہی آپ کو ایک موہوم امید لے کر سفر طائف اختیار کرنا پڑا۔ شعب ابی طالب کی آزمائش کے فوراً بعد ابو طالب کے مرض وفات میں گھر جانے پر قریش کا وفد آخری مرتبہ ابو طالب کے پاس آیا اور نبی کریم ﷺ کو تبلیغ دین سے روکنا چاہا۔ ان حالات کے پس منظر میں قریش کے اس وفد کو نبی کریم ﷺ نے جو جواب دیا وہ ابن اسحاق کی ایک روایت کے مطابق یہ تھا۔

> ''آپ لوگ صرف ایک بات مان لیں جس کی بدولت آپ عرب کے بادشاہ بن جائیں گے اور عجم آپ کے زیر نگیں آ جائے گا۔'' ابوجہل نے کہا: ''اچھا بتاؤ تو وہ بات ہے کیا؟'' آپؐ نے فرمایا: ''آپ لوگ لا الہ اللہ کہیں اور اللہ کے سوا جو کچھ پوجتے ہیں اسے چھوڑ دیں۔ (۱)

معلوم ہوا کہ ایسے بظاہر دل شکن حالات میں بھی نبی کریم ﷺ کو پختہ یقین تھا کہ یہ کلمہ بالآخر دنیا پر غالب آ کر رہے گا۔ اس سے بھی پہلے قریش مکہ کے ظلم وستم کی انتہا پر آپؐ نے خباب بن ارتؓ کو جو جواب دیا تھا، وہ بھی تاریخ نے محفوظ کر لیا کہ:

> اللہ پاک ضرور بالضرور اپنے اس کام کو پورا کر کے رہے گا تم لوگ دیکھ لو گے کہ اکیلا سوار صنعاء یمن سے حضر موت تک آئے گا۔ اور اللہ عزوجل کے سوا کسی کا خوف وہراس اس کے دل میں نہ ہوگا۔ اتنا اضافہ اور بھی ہے اور نہ بھیڑیے سے اپنی بکری پر خوف کرے گا۔ (۲)

ب: دوران ہجرت

شعب ابی طالب کے مرحلہ کے فوراً بعد ابو طالب اور حضرت خدیجہؓ کی وفات اور پھر طائف کا واقعہ پیش آیا اور پھر حالات ایسے بن گئے کہ کسی بھی لمحہ آپ کو قتل تک کیا جا سکتا تھا۔ آپ ﷺ اپنے کچھ جاں نثاروں کو حبشہ بھیج چکے تھے۔ بقیہ میں سے ایک بڑی تعداد کو مدینہ بھیجا جا چکا تھا۔ قریش کی آنکھ سے بچ کر آپؐ رات کی تاریکی میں مدینہ کے لیے نکل پڑے۔ آپ اپنے انتہائی عزیز شہر کو چھوڑ کر جانے پر مجبور تھے۔ راستے بدل بدل کر، غار ثور میں پناہ لیتے ہوئے، لق ودق صحرا میں تقریباً تنہا ہی محو سفر تھے۔

ایسے میں جب سراقہ آپؐ کو پکڑنے کی نیت سے بالکل سر پر پہنچ گیا لیکن پھر اسے اندازہ ہوا کہ آپؐ کی حفاظت اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے تو اس نے آپؐ سے درخواست کی کہ مجھ کو امن کی تحریر لکھ دی جائے۔ (۳)

حالات کے اس پس منظر اور بے سروسامانی کی اس مہاجرانہ کیفیت میں آپؐ کا حضرت ابوبکرؓ کے غلام عامر بن فہیرہ کے ہاتھ سے سراقہ کو امن نامہ تحریر کروانے کے منظر کو چشم تصور سے دیکھا جائے تو انسانی عقل، کامیابی کے مضبوط یقین پر دنگ رہ جاتی ہے۔

ج: مدنی دور کے نامساعد تین حالات میں

نبی کریمؐ اور مہاجر صحابہ کرامؓ کی مدینہ آمد کے بعد ۲ھ میں غزوہ بدر، ۳ھ میں غزوۂ احد اور پھر ۵ھ میں غزوۂ خندق کا معرکہ ہوا اور اگر مزید تھوڑا سا غور کر کے صورتحال کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ہجرت اور غزوہ بدر، غزوہ بدر اور غزوہ احد اور غزوہ خندق، تینوں وقفوں کے درمیان آٹھ آٹھ غزوات و سرایا مزید پیش آئے۔ (۴) (خندق کے بعد کے غزوات و سرایا ان کے علاوہ ہیں) خندق کا معرکہ وہ معرکہ ہے جس میں مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹا ڈالنے کے لیے کفار، مشرک، یہودی اور منافقین سب سے جو کچھ بھی بن پڑ سکتا تھا وہ انہوں نے کر ڈالا تھا اور مسلمانوں کو محصور ہو کر محض دفاع پر اکتفا کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کئی کئی وقت صحابہ کرامؓ اور نبی اکرمؐ فاقے سے رہتے۔ صحابہ کرامؓ اور نبیؐ کی نمازیں تک قضا ہو گئیں۔ اس انتہائی نازک موقع پر حلیف یہودیوں کی بغاوت نے اور ہیجانی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ یہودی قبیلہ بنو قریظہ جو مسلمانوں کا معاہد قبیلہ تھا اور مدینہ کے اندر ہی آباد تھا، اس کی بدعہدی کی اطلاع پر آپ کی کیفیت یہ تھی کہ

رسول اللہ ﷺ نے اپنا سر اور چہرہ کپڑے سے ڈھک لیا اور دیر تک چت لیٹے رہے۔ (۵)

ان حالات میں بھی اپنے مقصد اور اس دعوت کی کامیابی کا آپؐ کو یقین کامل تھا۔ اور آپ ﷺ نے جزیرہ نمائے عرب ہی نہیں شام، فارس اور یمن کی فتح کی خوش خبریاں، اس غزوہ کے آغاز سے پہلے خندق کی کھدائی کے دوران ہی میں سنا دی تھی۔ (۶) اور غزوہ کے بعد تو آپ ﷺ نے گویا اعلان فرما دیا کہ:

> اب ہم ان پر چڑھائی کریں گے وہ ہم پر چڑھائی نہ کریں گے۔ اب ہمارا لشکر ان کی طرف جائے گا۔ (۷)

۲: دعوتی عمل میں تدریج کا طریقہ

اسے الاول فالاول اور الاھم فالاھم کا اصول بھی کہا جا سکتا ہے یعنی جو چیز جتنی اولیت اور اہمیت کی حامل ہے اسے اتنی ہی اولین اور اہم حیثیت دی جائے اور اصل سے پہلے فروع اور حقیقت کے

بجائے مظاہر پر زور نہ دیا جائے۔ یہ بات سے بظاہر بڑی سادہ بلکہ معمولی محسوس ہوتی ہے لیکن دعوت دین کا کام کرنے والے افراد اور تحریکوں کی زندگی میں بڑے بڑے فیصلوں کے صحیح یا غلط ہونے کا دارومدار اس اصول کو پیش نظر رکھنے یا نہ رکھنے پر ہوتا ہے۔ یہ اصول سامنے نہ ہو تو جذباتی اور وضعی دلائل کی بنیاد پر فیصلے ہونے لگتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی حیات مبارکہ اس حوالے سے بھی ناقابلِ یقین حد تک کامل نمونہ ہے۔ اس نمونہ کی پیروی ہی میں تحریکوں، خصوصاً دینی تحریکوں کی کامیابی مضمر ہے۔ اصل مقصود اور منزل کیا ہے؟ ان منصوبوں پر عمل درآمد کے لیے طویل المیعاد اہداف اور منصوبے کیا ہونے چاہیں؟ اس کے لیے قلیل المعیاد اہداف اور منصوبے کیا ہوں؟ اصل مقصود حاصل کرنے کی راہ میں فوری اور مستقبل کی رکاوٹیں کیا ہوسکتی ہیں؟ ان کا تدارک کیسے ممکن ہے؟ کن چیزوں کو مؤخر یا ان سے صرف نظر کیا جاسکتا ہے؟ کن چیزوں پر قطعاً مداہنت اور سمجھوتہ نہیں ہوسکتا؟ کون سے امور معمولی لیکن فوری اہمیت کے ہیں اور کون سے بہت اہم لیکن مستقبل میں انجام دیئے جانے والے ہیں؟ یہ اور اس طرح کے اور بہت سے حکمت عملی سے متعلق سوالات ہیں جن کو سامنے رکھ کر سیرت کا مطالعہ علیحدہ سے ایک تحقیق کا موضوع ہے۔ یہاں محض چند اشارے کر دینا ہی کافی ہوگا۔

> رسول اللہ ﷺ کعبۃ اللہ میں بت رکھے ہوئے دیکھتے تھے لیکن آپؐ نے انہیں نہ تو خود توڑا اور نہ صحابہ کرام کو توڑنے کا حکم دیا، کیونکہ اس وقت اہم مسئلہ بتوں کے توڑنے کا نہیں تھا بلکہ دلوں پر پڑے ہوئے تالے توڑنے کا فریضہ درپیش تھا تاکہ جب یہ دل فتح ہو جائیں تو یہ خود ان بتوں کو توڑنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ (۸)

بت شکنی آپؐ کے پروگرام کا حصہ لازماً تھی لیکن آپ نے مکی دور میں یہ کام نہ کیا۔ حالانکہ ظاہر بین لوگ کہہ سکتے تھے کہ اللہ کا رسول موجود ہو اور کعبۃ اللہ صنم خانہ بنا رہے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ بلکہ آپؐ نے تو صلح حدیبیہ کے اگلے سال جب ذی قعدہ ۷ھ میں عمرہ ادا کیا، اس وقت آپؐ کے ہمراہ عورتوں اور بچوں کے علاوہ دو ہزار جاں نثار موجود تھے۔ قریب ہی وادی یاجج میں تمام سامان جنگ محفوظ تھا۔ عمومی تلواریں تو ساتھ موجود ہی تھیں (۹)۔ لیکن آپؐ نے اس موقع پر بھی بتوں کو گرانے یا توڑنے کا کام نہیں کیا۔ ہاں جب مکہ فتح ہوگیا تو آپؐ نے بت گرا دیئے، تصویریں مٹا دیں اور کعبہ کو واقعی کعبۃ اللہ بنا دیا۔

الاھم فالاھم کا اصول سامنے نہ ہو تو غزوۂ بدر کے بعد یہودی سردار کعب بن اشرف اور غزوہ خندق کے بعد ایک اور یہودی سردار سلام بن ابی الحقیق کا قتل اور یہودی قبیلہ بنو قریظہ کی تمام بالغ

افراد (جن کی تعداد چھ اور سات سو کے درمیان تھی (۱۰) کا بیک وقت قتل محض ایک انتقامی کارروائی محسوس ہوتی ہے جبکہ یہ اصول نظر کے سامنے ہو تو یہ سارے اقدام مبنی بر انصاف ہی نہیں عین حکمت کا تقاضا معلوم ہوتے ہیں۔ تدریج کا یہی وہ اصول ہے جو حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن بھیجتے وقت آپؐ نے بتایا کہ:

> تم یہودیوں اور عیسائیوں کی ایک قوم کے پاس جاؤ گے تو ان کو پہلے یہ دعوت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور محمد ﷺ اس کے رسول ہیں، جب وہ یہ مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں فرض کی ہیں اور یہ وہ یہ بھی مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر صدقہ (زکوٰۃ) فرض کیا ہے۔ یہ صدقہ ان کے دولت مندوں سے لے کر ان غریبوں کو دلایا جائے۔ (۱۱)

شراب اور سود کی بندش کا معاملہ ہو یا نماز و جہاد کے فرائض کی ادائیگی، یہ اصول ہر جگہ نظر آتا ہے کہ تربیت اور ترغیب کا معاملہ بتدریج ہو اور پھر اس کا نفاذ پوری قوت اور بڑے بھرپور انداز سے کیا جائے۔

۳: دعوت کی جامعیت

نبی اکرم ﷺ کے طریق دعوت کی ایک اہم خصوصیت اس کی جامعیت ہے۔ یہ دعوت زندگی کے ہر پہلو کو محیط ہے، فرد و اجتماع، ہر ایک کی اصلاح کے ہمہ گیر پروگرام کی حامل ہے اور اس میں دعوت کے تمام معقول اور قابل عمل طریقوں کو اختیار کرنے کی رہنمائی کا سامان موجود ہے۔

۱: زندگی کے ہر پہلو کو محیط

تاریخ کے مختلف ادوار میں، مختلف معاشروں میں طرح طرح کی اصلاحی تحریکیں برپا ہوتی رہی ہیں۔ یہ تحریکیں سیاسی، معاشی اور ثقافتی بھی رہی ہیں اور مذہبی، اخلاقی اور روحانی بھی۔ جبکہ دین اسلام کی دعوت بیک وقت سیاسی بھی ہے اور معاشی بھی، ثقافتی بھی ہے اور عائلی بھی، مذہبی بھی ہے اور اخلاقی بھی، روحانی بھی ہے اور جہادی بھی۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام میں یہ تمام امور نہ صرف ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ و پیوستہ ہیں بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل و تقویت کا باعث بھی ہیں۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

> حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ پوری سچائی اور ایمانداری کے ساتھ کاروبار کرنے والا تاجر نبیوں،

صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔ (۱۲)

اس حدیث مبارکہ میں تجارت کے کام کو جو بظاہر خالصتاً ذاتی منفعت اور دنیاداری کا کام اور ایک معاشی سرگرمی ہے، مذہبی، اخلاقی اور روحانی اہمیت کا حامل بھی بنا دیا گیا ہے اور اسے ان امور سے متعلق بھی کر دیا گیا ہے۔

زندگی کے ہر پہلو سے متعلق مخبر صادق ﷺ کے احکامات کا اندازہ مجموعہ احادیث کی کسی بھی کتاب کا جائزہ لینے سے بخوبی ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ''معارف الحدیث'' ہی پر نظر دوڑائی جائے تو ایمان و اخلاق، جن کی درستی اور تکمیل کے لیے آپؐ مبعوث ہوئے یا نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ جو کہ دین کے بنیادی ارکان ہیں یا دعوت و جہاد جو کہ دین کی امتیازی شان ہیں، کے علاوہ عام زندگی کے حوالے سے آپؐ نے جو ہدایات امت کو دیں، ان کے عنوانات میں سے کچھ یوں ہیں:

> قضاء حاجت اور استنجا سے متعلق ہدایت، وضو اور اس کے فضائل و برکات، غسل جنابت کا طریقہ، تیمم کا حکم ذکر اللہ کی عظمت و برکت، ماں باپ کی ابتدائی ذمہ داریاں، ماں باپ کے حقوق اہل قرابت کے حقوق، میاں بیوی کے حقوق، ہمسایوں کے حقوق، کمزور اور حاجت مند طبقوں کے حقوق، اسلامی برادری کا باہمی تعلق، عام مخلوقات کے ساتھ برتاؤ، آداب ملاقات، آداب مجلس، لیٹنے، سونے اور بیٹھنے کے بارے میں ہدایات، مجلسی گفتگو، ہنسی مزاح، چھینک، جمائی وغیرہ کے بارے میں ہدایات، کھانے کے آداب، پینے کے آداب، لباس کے احکام و آداب، ستر اور پردہ کے بارے میں ہدایات، نکاح و ازدواج اور اس کے متعلقات، معاشی معاملات، زراعت و باغبانی، قرض سے متعلق ہدایات، خرید و فروخت کے متعلق احکام، ہدیہ تحفہ لینا دینا، حاکم و قاضی سے متعلق احکام، رشوت لینا دینا، جھوٹی قسم، خلافت و امارت کے متعلق احکام وغیرہ۔ (۱۳)

ب: فرد و اجتماع، ہر ایک کی اصلاح

کسی معاشرہ اور ریاست میں فرد اور اجتماع کے باہمی تعلق کے حوالے سے مختلف نظاموں اور نظریات نے مختلف انتہاؤں کے درمیان ٹھوکریں کھائی ہیں۔ فرد کی کلی آزادی اور خودمختاری کے نتائج دیکھ کر اور کچھ اپنے طبعی رجحان کی بناء پر انسان نے اجتماعیت اختیار کی، پھر سرداری اور بادشاہت کے استبداد نے اسے آزادی کے نعرے بلند کرنے پر اکسایا لیکن معاشی و معاشرتی آزادی کے نام پر

استحصال سے نجات کے لیے اسے اجتماعیت و اشتراکیت کے نظریات تخلیق کرنے پڑے تاہم یہ نظریات پچھلے نظریہ و نظام سے بھی زیادہ بودے ثابت ہوئے اور اب پھر انفرادیت (Inividualism) اور کھلی منڈی کے معیشت (Open Market Economy) کے نام پر جس کی لاٹھی اس کی بھینس (Might is right) کا دور دورہ ہے۔ اور جب تک اسلام کے آفاقی و الٰہی نظام کو غالب اور مشکل حالت میں دنیا کے سامنے پیش نہیں کر دیا جاتا شاید دنیا اور اس کے عقل پرست دانشور اسی طرح فٹ بال بنے کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف لڑھکتے رہیں گے۔

اسلام نے مذکورہ بالا نظریات میں سے بہت سوں کی تشکیل و ترتیب سے صدیوں پہلے وہ نظام اور فلسفہ حیات پیش کیا جس میں فرد و اجتماع دونوں کی اہمیت بھی پیش نظر تھی، ان دونوں ہی کی اصلاح بھی مطلوب تھی اور ان کے درمیان بہترین توازن بھی پایا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر دیکھیے۔

مَن قَتَلَ بِغَيرِ نَفسٍ اَو فَسَادٍ فِي الاَرضِ فَكَانَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا وَمَن اَحيَا هَا فَكَانَّمَا اَحيَا النَّاسَ جَمِيعًا (۱۴)

(جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔ اور جس نے کسی کو زندگی بخشی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی)۔

انسانی جان کی اس قدر حرمت اور اہمیت، حقوق انسانی اور انفرادیت پسندی کا کوئی بھی علم بردار پیش نہیں کر سکتا۔ لیکن اسلام کی تعلیمات کی شان توازن ہی یہ ہے کہ حقوق کے تحفظ کے ساتھ ساتھ ذمہ داریوں کی ادائیگی کا مطالبہ بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ اس سے اگلی ہی آیت میں معاشرہ کی اجتماعی اصلاح اور بہبود کے نقطہ نظر سے یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ:

اِنَّمَا جَزٰؤُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللهَ وَرَسُولَه' وَيسعَونَ فِي الاَرضِ فَسَاداً اَن يَّقتِلُوآ اَو يُصلِبُوآ اَو تُقَطَّعَ اَيدِيهِم وَاَرجُلُهُم مِن خِلاَفٍ اَو يُنفَوا مِنَ الاَرضِ (۱۵)

(جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لیے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں یا سولی پر چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں، یا جلاوطن کر دیے جائیں۔)

یعنی انفرادی آزادی کو اجتماعی بگاڑ اور فساد کی حد تک قبول نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ایسا کرنا ایک

کے مقابلے میں بہت سوں کی حق تلفی کرنے کے مترادف ہوگا۔

فرد اجتماع دونوں کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ فرد، اجتماع اور معاشرہ سب کی اصلاح بھی بیک وقت اور ہمیشہ نبی کریمؐ کے پیش نظر رہتی تھی۔ فرد کی ذاتی روحانی اصلاح وارتقاء کے حوالے سے جہاں آپؐ یہ رہنمائی فرماتے ہیں کہ:

> ہر چیز کی ایک صفائی ہوتی ہے اور دلوں کی صفائی اللہ کا ذکر ہے اور اللہ کے عذاب سے بچانے والی چیزوں میں سے کوئی چیز ذکر الٰہی سے بہتر نہیں۔ (۱۶)

تو دوسری طرف حقوق العباد کے انتہائی باریک اور لطیف پہلوؤں پر بھی آپؐ نظر رکھتے اور اس حوالے سے ہدایات دیتے ہیں۔ ایک متفق علیہ حدیث جسے بخاری نے کتاب المظالم میں درج کیا ہے یوں ہے:

> حضرت جبلہؒ کہتے ہیں حضرت عبداللہ بن عمرؓ جب ہمارے پاس سے گزرتے تو فرماتے کہ رسول اللہؐ نے (دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر کھاتے وقت) دو کھجوروں کو ایک ساتھ اٹھا کر کھانے سے منع فرمایا ہے۔ مگر یہ کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے دوسرے بھائی سے اجازت لے لے۔ (۱۷)

معاشرتی اصلاح کے لحاظ سے اگر اس پہلو پر غور کیا جائے کہ جن جرائم کو سخت ترین قرار دے کر ان پر ''حد'' کا نفاذ کیا جاتا ہے وہ تمام جرائم وہ ہیں جو معاشرہ میں فساد کا موجب بنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سود، چونکہ معاشی، معاشرتی، دینی اور اخلاقی ہر طرح کے بگاڑ اور فساد کا سبب ہے اس لیے اس کی ممانعت قرآن وحدیث میں جتنے سخت الفاظ میں آئی ہے وہ الفاظ اور انداز کسی بھی اور جرم کے حوالے سے اختیار نہیں کئے گئے۔ بلکہ اس کام کو گویا پورے نظام اسلامی سے باہر نکل جانے کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔ پہلے تو اس کی کراہیت بتائی گئی (۱۸) اور اسے یہودیوں کے دو بڑے جرائم میں سے ایک بتایا گیا (۱۹) اور بالآخر سود کھانے والے کو ایسا شخص قرار دیا گیا جو شیطان کی لپٹ میں آ کر خبطی ہو چکا ہو، ہمیشہ کے لیے جہنم میں جانے والا ہو اور جس کے خلاف اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ کر دیا گیا ہو۔ (۲۰)

ج: دعوت کے لیے تمام معقول طریقوں کو اختیار کرنا

دین کی دعوت لوگوں تک پہنچانے کے لیے جو طریقہ بھی استعمال کیا جا سکتا تھا نبی کریم ﷺ نے اسے اختیار کرنے سے گریز نہیں کیا۔ مخاطبین کے لحاظ سے تین قسم کے لوگ ہو سکتے ہیں:

ا: متفرق افراد: آپؐ نے لوگوں سے فرداً فرداً رابطہ کر کے انہیں دین کی دعوت دی۔ ابتدائی

دور میں لوگ اسی طرح مسلمان ہوئے۔ مثلاً حضرت خدیجہؓ حضرت ابو بکرؓ وغیرہ۔ آپؐ کی یہ سنت تا حیات جاری رہی چنانچہ مدنی دور میں ایک مرتبہ ایک یہودی نوجوان بیمار ہوا۔ آپؐ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے، اسے دین کی دعوت دی اور وہ مسلمان ہو گیا۔ (۲۱)

۲: گروہوں کی شکل میں: آپؐ نے مختلف گروہوں کو مخاطب کر کے دین پیش کیا۔ قبائل کو بھی دعوت دی۔ اس کی سب سے نمایاں مثال خاندان عبدالمطلب کو کھانے کی دعوت پر بلا کر انہیں دین کی دعوت دینے کی ہے۔ (۲۲)

۳: عوامی سطح پر: آپؐ نے دعوت عام کے پیش نظر کوہ صفا پر چڑھ کر یا صباحاہ (ہائے صبح) کی بانگ درا لگائی۔ اس طرح اج کی زبان میں انفرادی رابطہ، چہار دیواری کے اندر جلسہء عام یہ تمام شکلیں، دین کی تبلیغ کے لیے نبی کریمؐ نے اختیار کیں۔

۴: دور دراز کے لوگ: جو لوگ مذکورہ بالا پہنچ سے بھی دور تھے ان کو دین کی دعوت دینے اور دین سکھانے کے لیے آپؐ نے افراد بھی بھیجے۔ (مثلاً حضرت مصعبؓ بن عمیر کو مدینہ بھیجا) اور مراسلات بھی روانہ کیے۔ جسے آج کے دور میں سفارت کاری اور ذرائع ابلاغ کا استعمال کہا جا سکتا ہے۔

دین کی دعوت پہنچانے کے ان تمام طریقوں ہی کو حضور اکرم ﷺ نے اختیار نہیں کیا بلکہ بات پہنچانے کے جو جو انداز ہو سکتے تھے وہ بھی اختیار کیے۔

تبلیغ و دعوت کے یہ تین اصول مسلمانوں کو سکھائے گئے:

> عقل و حکمت، موعظہ حسنہ اور مناظرہ بطریق احسن۔ مسلمان متکلمین نے بیان کیا ہے کہ تبلیغ و دعوت کے یہ تینوں اصول وہی ہیں جو منطقی استدلال میں عموماً کام میں لائے جاتے ہیں۔ یعنی برہانیات..... خطابیات..... جدلیات.....
>
> ..... جب ہم کسی کے سامنے کوئی نئی بات پیش کر کے اس کے قبول کرنے کی دعوت دیتے ہیں تو عموماً تین طریقے برتتے ہیں یا تو اس بات کے ثبوت اور تائید میں کچھ دل نشین دلیلیں پیش کرتے ہیں یا اس کو مخلصانہ نصیحت کرتے ہیں..... یا اس کی دلیلوں کو مناسب طریقے سے رد کر دیتے ہیں، اس کی غلطی کو اس پر واضح کرتے ہیں۔ پہلے طریقہ کا نام حکمت، دوسرے کا موعظہ حسنہ اور تیسرے کا نام جدال طریق احسن ہے۔ تبلیغ و دعوت، کے یہی تین طریقے ہیں۔ (۲۳)

۴: مکمل منصوبہ بندی کا اہتمام

بسا اوقات مسلمان یقین کامل اور توکل علی اللہ کا غلط مفہوم لینے کی بناء پر کام کی صحیح اور مکمل منصوبہ بندی نہیں کرتے اور ناکامی کی صورت میں اسے ''تقدیر کا لکھا'' کہہ کر حالات کا تجزیہ کرنے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ یا پھر حقیقت پسند بنتے ہوئے ''زمینی حقائق (Ground Realities)'' کے نام پر مادہ پرستانہ طرز فکر اختیار کرتے ہوئے روحانی پہلوؤں اور غیبی تائید کے مضبوط سہارے سے صرف نظر کر لیتے ہیں۔ حالانکہ اصل حقیقت پسندی یہ ہے کہ یہ دنیا اسباب کی دنیا ہے اور اس پر حتمی گرفت مسبب الاسباب کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبوی اسلوب دعوت میں یہ چیز ہمیشہ بڑی واضح طور پر نظر آتی ہے کہ آپؐ نے ہر لحاظ سے مکمل منصوبہ بندی کی، ہر خطرہ سے نمٹنے کی تدبیر کی اور پھر اللہ سے مدد کے طلب گار ہوئے۔ مکہ سے مدینہ ہجرت کا معاملہ ہو، غزوہ بدر میں جگہ کا انتخاب اور تیاریاں ہوں، غزوۂ خندق میں خندق کا کھودا جانا، حضرت نعیمؓ کی مہم یا بنو غطفان سے مصالحت کی تجویز ہو، فتح مکہ کی تیاریاں ہوں یا غزوہ تبوک کی مہم غرض ہر موقع پر آپؐ کی بہترین منتظمانہ صلاحیت کا بھی اظہار ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات پر کامل بھروسے کا بھی۔

حواشی و حوالہ جات

۱: مبارک پوری، صفی الرحمٰن، الرحیق المختوم، المکتبۃ السلفیہ لاہور، طبع سوم، سن ندارد، ص ۱۶۳، ۱۶۴

۲: صحیح بخاری، ج ۱، کتاب المناقب، قدیمی کتب خانہ کراچی، ص ۵۴۳

۳: ایضاً، کتاب الفضائل بباب الہجرۃ، ۴/ ۶۵۷

۴: الرحیق المختوم ص ۲۶۵ تا ۴۲۵

۵: ایضاً ص ۴۲۰

۶: واقدی، محمد بن عمر بن واقد، المغازی للواقدی، نشر دانش اسلامی، ۱۴۰۵ھ، ج اول، ص ۴۵۰

۷: صحیح بخاری، ج ۲، کتاب المغازی، باب غزوۃ الخندق، ص ۵۹۰

۸: زیدان، عبدالکریم، اصول دعوت دین، ادارہ تحقیقات اسلامی، سن ندارد، (مترجم ساجد الرحمٰن صدیقی کاندھلوی) ص ۱۹۸، ۱۹۹

۹: الرحیق المختوم ص ۵۲۲

۱۰: ایضاً ص ۴۳۰

۱۱: بخاری، کتاب التوحید، ۸/ ۱۶۴

۱۲: ترمذی، سنن ترمذی، ج ۱، ابواب البیوع، ص ۱۴۵

۱۳: محمد منظور نعمانی، معارف الحدیث، ج ۳ تا ۷

۱۴: القرآن الحکیم، المائدہ ۵:۳۲

۱۵: القرآن الحکیم، المائدہ ۵:۳۳

۱۶: مشکوٰۃ، کتاب الدعوات، باب ذکر اللہ عزوجل، ۱/۷۰۱

۱۷: عبدالباقی، محمد فواد، اللولو والمرجان، مکتبہ قدوسیہ لاہور، اشاعت اول ۱۹۹۷ء ج ۲، ص ۲۰۰، حدیث نمبر ۱۳۲۶

۱۸: القرآن الحکیم، الروم ۳۰:۳۹ (قرآن مجید کی یہ پہلی آیت ہے جو سود کی مذمت میں نازل ہوئی، اس کے بعد سود در سود کو منع کیا گیا (آل عمران ۳:۱۳۰) اور سب سے آخر میں سود ہی کی قطعی حرمت کا فیصلہ کر دیا گیا (البقرۃ ۲:۲۷۵) تفہیم القرآن ج ۳، ص ۷۸۹، ۷۶۰)

۱۹: القرآن الحکیم، النساء ۴:۱۶۱

۲۰: القرآن الحکیم، البقرۃ ۲:۲۷۵-۲۷۸

۲۱: صحیح بخاری، ج ۲، کتاب المرضیٰ، ص ۸۴۵

۲۲: طبری، ابوجعفر محمد بن جریر، تاریخ طبری، نفیس اکیڈمی کراچی، اشاعت پنجم، سن ندارد (مترجم سید محمد ابراہیم) ج ۱، ص ۸۹

۲۳: ندوی، سید سلیمان، سیرت النبیؐ، مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور، ۱۹۷۵، ج ۴، ص ۳۲۵